اُردو شاعری میں لسانی تشکیلات

منیبہ زہرا نقوی

Muneeba Zahra Naqvi

Ph. D Scholar, Department of Urdu,
University of Sargodha

عبدالعزیز ملک

Abdul Aziz Malik

Lecturer, Dapartment of Urdu,
Govt. College University, Faisalabad.

Abstract:

The research paper under review is based upon the discussion regarding the scope of linguistic formations in Urdu poetry. Moreover, it has also been analysed that to what extent the modern literature is inspired by the Western literary movements. It has also been evaluated critically how much influence regarding the debate of linguistic formation is prevalent in Urdu language and poetry both positively and negatively.

اردو زبان و ادب میں لسانی تشکیلات کی بحث پرانی نہیں ہے۔ مذکورہ مباحث کو ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائی کے درمیان پہلی مرتبہ افتخار جالب اور ان کے احباب نے اٹھایا لسانی تشکیلات کی تعریف، ہیئت، رجحان اس کے انجذاب و قبول اور اس کی فکری اساس سے آگاہی و روشناسی کی خاطر ہمیں سب سے پہلے عالمی سطح پر ہونے والی تہذیبی، ثقافتی، سماجی اور فکری تبدیلیوں سے آگاہی حاصل کرنا ہوگی جن کے بغیر لسانی تشکیلات کی اصل روح کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء تک کا درمیانی عرصہ عالمی سطح پر وقوع پذیر ہونے والی مسلسل تبدیلیوں کے زیر اثر دکھائی دیتا ہے اس عرصہ کے دوران جہاں عالمی سطح پر محل وقوع کے اعتبار سے تبدیلیاں آئیں اور مختلف نظریاتی مملکتیں وجود میں آئیں وہیں پر مذکورہ تبدیلیاں سماج، ادب اور فکر میں مختلف تحریکوں کے آغاز کا بھی پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ مغرب نے طاقت کے مرکز کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ جس کے باعث مغرب میں وقوع پذیر ہونے والی ہر ادبی، فکری، سماجی اور لسانی تحریک کا

اثر کسی نہ کسی صورت دنیا کے دیگر ممالک میں بھی ظاہر ہوا۔ اور برصغیر پاک و ہند بھی ان اثرات سے الگ نہ رہ سکا اور جدید اردو ادب پر بھی ان مغربی تحریکوں کے اثرات مرتب ہوئے۔ مغربی فکر کو ارسطو کے بعد اگر کسی شخص نے انفرادی طور پر بہت زیادہ متاثر کیا تو وہ فرائیڈ ہے۔ فرائیڈ ایک ایسے شخص کے روپ میں سامنے آیا، جس نے نفسیات کے علم کے بل بوتے پر انسان کی باطنی شخصیت کو ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ فرائیڈ کے نزدیک کسی بھی تخلیق کا بنیادی محرک دراصل وہ انسانی خواہشات ہوتی ہیں جو لاشعور میں دبی رہتی ہیں جب یہ خواہشات ترفع سے ہمکنار ہوتی ہیں تو تخلیق کا سبب بنتی ہیں۔

یہ فرائیڈ اور نفسیات کا علم ہی تھا جس کے بل بوتے پر تخلیقی محرکات تک رسائی بڑی حد تک ممکن ہو گئی۔ فرائیڈ کے نظریات کا مغرب میں سب سے زیادہ اثر ''آزاد تلازمہ'' خیال''، ''سر ریلزم''، ''اور ڈاڈازم'' کی تحریکوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ عالمی سطح پر ہونے والی دو عالمی جنگیں بڑی حد تک ذہنی شکستگی کا سبب بنیں اور ان دو جنگوں کے درمیانی عرصے میں ڈاڈاازم اور سر ریلزم کی تحریکیں پروان چڑھیں۔ اس عرصے کے معروضی حالات کے باعث لوگوں میں انتشار اور بے چینی کو ہر صورت محسوس کیا جا سکتا ہے جس کے باعث مروجہ اقدار سے کھلم کھلا بغاوت کا عنصر سامنے آتا دکھائی دیتا ہے۔

ڈاڈاازم کی بنیاد بھی اسی انکار اور بے زاری پر استوار ہے اس تحریک میں شامل لوگوں کے نزدیک کوئی بھی قدر یا اصول بامعنی نہیں ہیں سر ریلزم کی بنیادیں بھی ڈاڈاازم کی تحریک سے پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں مگر ڈاڈاازم کے برعکس ان کا منشور تحریر کی صورت میں سامنے آیا۔ اس تحریک کا لب لباب یہ تھا کہ ظاہری دنیا اور ہمارے حسی محسوسات کے برعکس ایک اور دنیا بھی ہے اور یہ عالم اس قدر ماورا ہے کہ شعور کے ذریعے اس عالم تک رسائی ممکن نہیں۔ یعنی محسوسات کی یہ دنیا ہمارے ادراک و فہم سے ماورا ہے۔ شعور کی حدوں سے آگے تحت الشعوری تجربے کے تحت اس عالم تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس تحریک کے مطابق کسی بھی چیز کی اصل حقیقت وہی ہے جو کہ ہمارے لاشعور میں آتی ہے اور اس حقیقت کو انسان اُس وقت اپنی گرفت میں لے سکتا ہے، جب شعور اس حقیقت پر حاوی ہو جائے۔

سر ریلزم حقیقت سے ماورا ایک اور حقیقت کے معنی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس تحریک کے ذریعے ان تمثالوں کو پیش کیا گیا، جو شعور اور لاشعور کے امتزاج سے تخلیق ہوتی ہیں۔ اور فن کار کے اندر کی آنکھ انھیں جس انداز میں دیکھتی، محسوس کرتی یا ان کا احاطہ کرتی ہے اُس انداز میں ان کو کاغذ پر منتقل کرنے کی کوشش کرتی ہے، چنانچہ سر ریلزم کی تحریک آزاد تلازمہ خیال کی رو کو ایک ایسی اعلیٰ صورت میں پیش کرنے کا دعویٰ کرتی ہے جس میں ذہنی تمثال حقیقت کے مماثل ہونے کے بجائے عینِ حقیقت (۱) ہو جاتی ہے۔

سرریلزم اور ڈاڈا ازم کے ساتھ ساتھ وجودیت بھی ایک ایسی تحریک کے طور پر سامنے آتی ہے جس کی اہمیت سے انکار کسی صورت ممکن نہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں سارتر کے نظریات کے زیرِ اثر بامِ عروج پر پہنچنے والی اس تحریک کو عقلیت پرستی اور سائنس پرستی کا ردِ عمل بھی کہا جاتا ہے۔ جس میں فرد کی ذات کی اہمیت اور وجود کی جوہر پر فوقیت نے مابعد الطبیعات کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

> ''وجودیت کے اظہار کی تحریکی و تخلیقی سطح پر باقاعدہ کاوش ساٹھ کی دہائی میں جدیدیت کی تحریک کے زیرِ اثر ہوئی۔۔۔۔۔۔ترقی پسندوں اور ان کے فکر و فلسفہ کو "نابود" کرنے کی کوششوں کے بعد ساٹھ کی دہائی میں جس فلسفہ کو سب سے زیادہ فروغ دیا گیا وہ وجودیت ہی کا تھا۔''(۲)

وجودی تحریک کے اثرات بھی اس نئی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں، جس کو اردو میں لسانی تشکیلات کا نام دیا گیا اور جس کا مختصر احاطہ کرنا ان صفحات پر ضروری ہے۔ ردِ تشکیلی فکر بھی مذکورہ بالا تحریکوں کی طرح ایک ایسی تحریک کی صورت میں سامنے آتی ہے جس میں زبان و بیان اور معانی مفاہیم کے پرانے نظام کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا اور نئے پیرائے اختیار کیے گئے۔ ژاک دریدا کی اس نظریاتی فکر کے نزدیک الفاظ میں کوئی معنی اور مفہوم نہ صرف یہ کہ مستقل اور دیرپا نہیں ہوتا بلکہ سرے سے موجود ہی نہیں ہوتا۔ یہ دراصل قاری کی قرأت کا ایک مسلسل عمل ہے جو معنی خیزی کا سبب بنتا ہے۔ ژاک دریدا اس مسلسل قرأت کے عمل کو متشدد فوقیتی تدارج کا نام دیتا ہے جس میں معنی مسلسل التوا کا شکار رہتے ہیں اور یہ التوا قاری کی معنی اور مفاہیم تک بہتر رسائی میں معاون اور مدد گار ٹھہرتا ہے۔

مذکورہ بالا تحریکوں کے علاوہ ایسی تمام تحریکیں اور رجحانات جن میں قدیم فکر اور اساس کو رد کیا گیا تھا، نئی شاعری میں بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ وہ سارا پس منظر تھا جس سے نئی شاعری کے پرچارک گروہ نے فکری رہنمائی حاصل کی اور اردو شاعری میں کلاسیکیت کو آڑے ہاتھوں لیا اور ہر روایت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اردو شاعری میں افتخار جالب اس گروہ کے سربراہ کے طور پر سامنے آئے اور ان کی مرتّبہ کتاب ''نئی شاعری'' میں شامل ان کا مضمون ''لسانی تشکیلات'' نئی شاعری کے منشور کے طور پر سامنے آیا۔ اس منشور سے آگاہی سے قبل ان معروضی حالات سے آگاہی ضروری ہے جن کے تحت ہر روایت اور کلاسیکیت کے خلاف بغاوت کا علم بلند ہوا۔

گذشتہ صدی میں صنعتی اور اس کے بعد سائنسی انقلاب نے فکری طور پر لوگوں کے ذہنوں پر مختلف اثرات مرتب کیے۔ سائنسی شعور نے مابعد الطبیعیاتی نظامِ فکر کو یکسر رد کر ڈالا اور نئے شاعر نے بھی اسی سائنسی فکر کو بخوشی قبول کیا۔ اس انجذاب و قبول کا سب سے بڑا نقصان پرانی اقدار کے

تصورات کو ہوا جو یکسر بے معنی اور فضول دکھائی دینے لگے۔ سائنسی علوم اور وجودیت کے زیر اثر نئے شاعر نے اپنی شاعری میں اپنے دور کے مسائل کا اظہار کرنا چاہا تو اس اظہار کے لیے پرانی شاعری کو قابل قبول نہ سمجھا۔ گویا یہ تبدیلی کا نقطہ آغاز تھا جو کہ تین مختلف سطحوں پر وقوع پذیر ہوئیں اور تین سطحیں موضوع، ہئیت اور الفاظ قرار پائیں۔ نئے شاعر نے اظہار کا دامن تنگ محسوس کیا تو پرانی شعری اقدار کو یکسر نظر انداز کر دیا اور ہئیت، موضوع، اور زبان کے حوالے سے تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی۔ ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے ہونے والی تبدیلیاں نئی نہیں تھیں کہ ان کو قبول نہ کیا جاتا اس حوالے سے نئی شاعری اور نئے شاعر کے تخلیقی رجحانات کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کہتے ہیں:

> ''نئی شاعری کے طرز اظہار کا بھی اپنا خاص میتھڈ ہے۔ نیا شاعر لفظوں کی معنویت خود تخلیق کرنے پر قادر ہے وہ لفظوں کے متوارث ادبی مفاہیم پر یقین نہیں رکھتا۔''(۳)

کیونکہ نئے شاعر کے نزدیک لفظوں کے متوارث ادبی مفاہیم اپنے تہذیبی رویوں کے باعث معنویت کھو چکے ہیں اور مردہ ہو چکے ہیں۔ اس لیے نیا شاعر تو لفظوں کو نامیاتی اکائیاں سمجھتا ہے جن سے معنی و مفہوم کی نئی شکلیں بنتی رہتی ہیں۔ نئی شاعری نے ادبی اور لسانی پس منظر میں اُس وقت ہلچل پیدا کر دی، جب لفظ اور لسان کے حوالے سے تبدیلیاں کی گئیں۔

> ''جہاں تک لسانی تشکیلات کا تعلق ہے تو یہ تحریک ان نظم نگاروں نے شروع کی جو نئی شاعری کے لیے پرانی زبان کو ترک کر کے جدید لسانی ضرورتوں کو محسوس کرتے تھے۔''(۴)

نئی شاعری کے پرچارکوں کے نزدیک لفظ کے قدیم مفاہیم دم توڑ چکے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ انہیں نئے مفاہیم عطا کیے جائیں' جو عصر کے عین مطابق ہوں۔ ان تمام خیالات اور نظریات کو سمجھنے کے لیے افتخار جالب کی مرتبہ کتاب ''نئی شاعری'' اہم ٹھہری جو لسانی تشکیلاتی بحث میں منشور کی حیثیت رکھتی ہے۔ خاص طور پر اس میں شامل افتخار جالب کا مضمون ''لسانی تشکیلات'' اِس تمام کو فکری بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مذکورہ مضمون میں سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> ''لسانی تشکیلات اساسی طور پر شعر و ادب کی نیابت کرتی ہیں۔ مواد کو اس ہیت میں دیکھنا رائج الوقت الحاقی محاکموں سے نجات ہی نہیں دلاتا، بلکہ اِس جوہر خاص کو بلا شرکت غیرے ممیّز کرتا ہے جس کی منزہ شکل و صورت کی پہچان از خود ایک مسلک کی حیثیت رکھتی ہے۔''(۵)

لسانی تشکیلات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے۔ افتخار جالب آگے چل کر بتاتے ہیں:

> ''لسانی تشکیلات بحران کو پیدا کرنے والے موضوع اور صیغہ اظہار کی دوٹوک

تقسیم کو رد کرتی ہیں کہ لسانی تشکیلات نہ موضوع ہیں، نہ صیغہ اظہار؛ بلکہ ان پر حاوی اور ان سے ماورا وہ کلی صداقت ہیں جس کے حصے بخرے نہیں کیے جا سکتے۔''(۶)

لسانی تشکیلات کے حوالے سے لفظ کی اہمیت پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہر لفظ اپنی موجودگی کا جواز دوسرے لفظوں سے مہیا کرتا ہے۔ اس کی نہج اور رفتار آپس کے تصادم اور ٹکراو سے پیدا ہوتی ہے۔ یوں نہیں کہ کسی خیال یا جذبے کو بیان کرنے کے لیے الفاظ پر قید لگائی ہے۔ یہ قید تو ان رشتوں اور سلسلوں سے پیدا ہوتی ہے جو ادب پارے کے اندر موجود ہیں یہ رشتے اور سلسلے اپنا جبر خود تخلیق کرتے ہیں۔ ان پر خیال یا جذبے کا بیرونی جبر نہیں جو لفظ آتا ہے وہ اپنے سے پہلے اور بعد کے لفظوں کو اپنے جبر سے متغیر کرتا ہے۔''(۷)

افتخار جالب کے مضمون ''لسانی تشکیلات'' پر بحث کرتے ہوئے جابر علی سید نے بعض اہم امور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لسانی تشکیلات کے افتتاحی جملے ''لسانی تشکیلات، اساسی طور پر شعر و ادب کی نیابت کرتی ہیں۔۔۔۔ از خود مسلک کی حیثیت رکھتی ہے'' پر بحث کرتے ہوئے جابر علی سید کہتے ہیں:

''اِس جملے کا ماحصل ہے کہ شاعری میں زبان ایک مستقل بالذات حیثیت رکھتی ہے لیکن اس جملے کی پہلی کلاز میں لسانی تشکیلات کو شعر و ادب کا نائب کہا گیا ہے یہ تضاد بیانی ہے جو پہلے ہی جملے میں پیدا ہو گئی ہے نیابت اور مستقل بالذات ہونا دو مختلف اور متضاد خصوصیتیں ہیں۔''(۸)

افتخار جالب کی ''لسانی تشکیلات'' کی بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک الفاظ قائم بالذّات ہیں اور یہ خود شئیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ افتخار جالب اور ان کے ہم نواؤں کے نزدیک قدیم زبان اور اس کے علائم و رموز اور استعارے ایک مخصوص تہذیبی پس منظر کی وجہ سے اپنی اہمیت کھو چکے ہیں اور نئے زمانے کے اظہار کے تقاضوں کو نبھانے سے قاصر ہیں۔ موجودہ زمانے میں جہاں شاعری عصری مسائل کا پرچار کر رہی ہے وہاں ان عصری مسائل کے اظہار کے لیے نئے الفاظ کی ضرورت سے بھی کسی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نئے الفاظ نہ صرف نئے موضوعات کے اظہار کا وسیلہ ثابت ہوں گے بلکہ نئے تلازماتی رشتوں کے جنم کا سبب بھی بنیں گے۔ جن سے لامحالہ زبان بھی وسعت سے ہم کنار ہو گی۔ اس سلسلے میں یہ بات غور طلب ہے کہ افتخار جالب کے نزدیک کوئی بھی لفظ غیر شاعرانہ نہیں ہوتا لہٰذا انہوں نے اپنی شاعری میں نہ صرف ہر لفظ کو استعمال کیا بلکہ اسے اہمیت بھی دی۔

''انیس ناگی''، ''شعری لسانیات'' میں رقمطراز ہیں: ''شاعر مروجہ نفسیاتی سیاق وسباق کی پیروی نہیں کرتا بلکہ خود نئے سیاق وسباق تخلیق کرتا ہے۔'' (۹) عبدالحق کھامی، افتخار جالب کی لسانی تشکیلات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''افتخار جالب کی تمام شعری کوششیں مروجہ زبان کی توڑ پھوڑ اور ایک نئی زبان کی تخلیق پر مرکوز دکھائی دیتی ہیں افتخار جالب کے نزدیک جب جذبات، احساسات اور تجربات خیال کا پیکر ڈھونڈتے ہیں' تو لفظ بن جاتے ہیں لفظوں سے ماورا خیال کا کوئی وجود نہیں ہے۔'' (۱۰)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لسانی توڑ پھوڑ کے اس عمل کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟ کیا زبان کے پیرایہء اظہار میں تنگی محسوس کی گئی یا اس کے عوامل ومحرکات کچھ اور تھے اس حوالے سے عرض کرنا ضروری ہے کہ لفظ اور لسان معاشرتی عمل سے کسی بھی صورت الگ اور جدا نہیں ہوتے۔ الفاظ اپنے معانی اور مفہوم ایک مسلسل معاشرتی عمل کے نتیجے میں ہی حاصل کرتے ہیں جس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ لسانی توڑ پھوڑ کے اس عمل کا اصل محرک وہ تہذیبی ومعاشرتی بگاڑ اور توڑ پھوڑ تھا' جو سوسائٹی میں مسلسل ہو رہا تھا۔ جاگیردارنہ نظام کے بعد سرمایہ دارانہ استحصالی نظام اور پھر سائنس و ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی نے آج کے انسان کو ذہنی طور پر ایک ہنگامہ خیز صورت حال کے سامنے لا کھڑا کیا ہے جس میں انسانی فطرت میں پائے جانے والی بے چینی اور تجسّس، نئی نئی چیزوں کی جستجو اور کھوج نے انسان کے سامنے دنیا اور اس میں موجود چیزوں کو محدود کر دیا اور انسان لامحدود کے پیچھے چل نکلا لسانی توڑ پھوڑ بھی اُسی لامحدود کی جستجو کا ایک نتیجہ ٹھہری۔ اس حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں ۶۰ء کی دہائی میں غزل کے حوالے سے جو تجربات کیے گئے' وہ غزل کی لگی بندھی روایات سے گریز اور منہ زور بغاوت کے مابین ایک ایسا تجرباتی عمل ثابت ہوئے کہ جس نے زبان و بیاں اور لسانی تجربات کی سطح پر نئے دریچے کھول دیے۔ نئی سوچ، نئے مفاہیم، نئی زبان اور نئے تجربات سے غزل کا دامن وسعت اختیار کرتا چلا گیا۔ اور ان تجربات کے بعد اُردو غزل کو بالکل ایک نیا اسلوب' نیا لہجہ اور نئی شکل ملی۔ (۱۱)

پھر یہاں یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ آج کے زمانے کے انسان نے عطا کی گئی چیزوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چاہے وہ لفظ یا ان کو عطا کیے گئے معانی اور مفاہیم ہی کیوں نہ ہوں اور جب یہ لفظ، معنی اور مفاہیم شاعر کی میراثِ تخیل بنتے ہیں تو شاعر کے کمال ہنر پر منحصر ہے کہ وہ انہیں کس انداز سے برتتا ہے۔ شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن نے اس ضمن میں جو رائے دی ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ حقیقی معنوں میں شاعر وہ شخص ہے کہ جو شعر میں نیا پن پیدا کرنے کا ہنر جانتا ہو۔ ایسا شاعر جو نہ تو معنی میں کوئی نیا پن پیدا کرنے کی راہ پیدا کرے نہ الفاظ کے استعمال سے خوبی و

سلامت کا رنگ شعر میں اجاگر کر سکے۔ اس کے علاوہ شاعری کے وہ موضوعات جو قبل ازیں متعدد شعراء نے استعمال کیے اگر نیا شاعر ان مضامین کو پہلے سے زیادہ بہترین اور خوشنما رنگ میں نہ باندھ سکے اور نہ ہی وہ ایسی معنویت پیدا کر سکے کہ جو شعر میں معانی کا رخ کسی نئی سمت پھیر سکے تو ایسے شاعر کو جو بھی فضیلت حاصل ہے وہ صرف موزونیت کلام کے باعث حاصل ہے اور اسے 'مولانا مجازاً شاعر کہتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ میرے نزدیک ان کوتاہیوں کے بعد وہ اس فضیلت کا مستحق بھی نہیں رہتا۔(۱۲)

اسی حوالے سے مزید بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب زبان کا اسلوب بدلتا ہے تو بلند پرواز تخیل کے مالک اذہان، زبان کی تراش خراش سے ایسے ایسے نئے پیرایہء اظہار تخلیق کرتے ہیں کہ ہر خاص وعوام کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں اور ہر شخص کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہی گفتار پیدا کرے اس لیے رفتہ رفتہ وہ جدّت وندرت قدامت کے ساتھ مل کر بلاغت زبان کا ایک جزو ہو جاتی ہے۔(۱۳)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لسانی تشکیلات یا نئی شاعری کی اس بحث نے اردو زبان اور شاعری کو مثبت اور منفی دونوں حوالوں سے متاثر کیا۔ اس بحث کا مثبت پہلو دیکھا جائے تو اردو شاعری اور زبان کو اس تحریک نے نئے معنوی رجحانات سے روشناس کروایا۔ بطور زبان اردو کا دامن وسیع ہوا۔ کیونکہ لسان کے اس تشکیلاتی عمل کے نتیجے میں مقامی زبانوں کی طرف توجہ دی گئی' جن کے نتیجے میں نئے الفاظ اردو میں شامل ہوئے اور پرانے الفاظ کو نئے معنی اور مفاہیم عطا کیے گئے۔ جو مجموعی طور پر ایک مثبت پیش رفت تھی۔

جبکہ اس گروہ نے جب کلاسیکی شعری روایت کو یکسر نظر انداز کیا اور زبان میں توڑ پھوڑ کا عمل شروع کیا تو اس کا منفی پہلو بھی سامنے آیا۔ کیونکہ لسانی تشکیلات کے عمل میں زبان کے بنیادی سانچوں پر حملہ کیا گیا تھا۔ جو کہ بذات خود ایک منفی عمل ہے۔ اگرچہ اس گروہ کا مطمع نظر درست تھا لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا وہ کئی خرابیاں پیدا کر گیا اور پھر زبان کے بنیادی سانچوں' قوائد اور رائج معانی و مفاہیم سے انکار کے باعث اس گروہ کے شعراء کی شاعری اگرچہ تازہ ہوا کا جھونکا ٹھہری، مگر اردو کی شاعری روایت میں کوئی مقام ومرتبہ قائم نہیں کر سکی۔

حوالہ جات

۱۔ سروری، عبدالقادر، جدید اردو شاعری، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، بار ششم، ۱۹۶۷ء، ص:۳۷

۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اردو، بار پنجم، ۲۰۰۴ء، ص:۱۰۸

۳۔ روش ندیم، درویش، صلاح الدین، جدید ادبی تحریکوں کا زوال، راولپنڈی: گندھارا بکس، بار اوّل، ۲۰۰۲، ص:۹۳

۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، نئی شاعری نیا میتھڈ، (مضمون) مشمولہ: نئی شاعری، مرتبہ: افتخار جالب، لاہور: نئی مطبوعات، ۹۔سرکلر روڈ، باراوّل، ۱۹۶۶ء، ص: ۲۹۵۔۲۹۴

۵۔ طارق ہاشمی، اردو غزل۔نئی تشکیل، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، باراوّل، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۷۳

۶۔ افتخار جالب، لسانی تشکیلات، (مضمون) مشمولہ: نئی شاعری، لاہور: نئی مطبوعات ۹۔سرکلر روڈ، باراوّل، ۱۹۶۶ء، ص: ۲۴۷

۷۔ ایضاً، ص: ۲۴۹۔۲۴۸

۸۔ ایضاً، ص: ۲۷۳۔۲۷۲

۹۔ جابر علی سیّد، جدید شعری تنقید، ملتان: بیکن بکس، گلگشت، باراوّل، ۲۰۰۲ء، ص: ۱۵۵

۱۰۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، شعری لسانیات، لاہور: فیروز سنز، باراوّل، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۰

۱۱۔ عبدالحق کھامی، نئی شاعری نیا آفاق، (مضمون) مشمولہ: نئی شاعری، مرتبہ: افتخار جالب، لاہور: نئی مطبوعات ۹ سرکلر روڈ، ص: ۱۵۳

۱۲۔ طارق ہاشمی، اردو غزل۔نئی تشکیل، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، باراوّل، ۲۰۰۸ء، ص: ۲۳۰

۱۳۔ عبدالرحمٰن، مولانا، مرأۃ الشعر، لاہور: کتاب خانہ نورس، کبیر سٹریٹ، اردو بازار، ۱۹۵۰ء، ص: ۱۸

۱۴۔ ایضاً، ص: ۸۹

☆.....☆.....☆